جبران خلیل جبران کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر عذرا پروین*

Abstract:

Jibran Khalil Jibran (January 6,1883-April 10 1931) was a Lebanese artist, Poet and writer. Born in the town of Bsharri in the north of Lebanaon as a young man he immigrated with his family to the United states. where he studied art and began his literary career, Writing in both English and Arabic. In the Arab World. Jibran is regarded as a literary and political rebel. His romantic style was at the heart of renaissance in Modern Arabic Literature especially prose poetry, breaking away from the classical school. In Lebanon , he is still celebrated as a literary hero.

He is chiefly known in the English speaking world for his 1923 book. The Prophet , an early example of inspirational fictio including a series of philosophical essays written in poetic English prose. The book sold well despite a cool critical reception, gaining popularity in the 1930s and again especially in the 1960s counterculture . Gibran is the third best selling poet of all time, behind shakespeare and Laozi.

جبران خلیل جبران کے نام سے ہمارے اردو قارئین بڑی حدتک آشنا ہیں اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے اپنی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں اسے پڑھا بھی ضرور ہوگا۔''اشک وتبسم'' ''ریت اور جھاگ''۔''ارضی دیوتا''۔''ٹوٹے ہوئے پر۔''زرد پتے'' اور''دیوانہ'' جیسے حزن آمیز اور شاعرانہ عنوان والے اس کے چھوٹے چھوٹے کتابچوں نے شاید کبھی ہمارا دل بھی بہلایا ہو٘اور ہمیں کچھ دیر کے لئے حقیقت کی دنیا سے نکال کر تصور وخیال کی دنیا میں لے گئے ہوں جو عمر کے ایک حصے میں بڑی خوش آئند لگتی ہے۔لیکن عجیب بات ہے کہ ہم میں سے بہت کم لوگوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ جبران خلیل جبران آخر ہے کون؟ وہ کس طرح کا ادیب ہے؟ اس کا تصورِ دنیا (World View) کیا ہے؟ اور اپنے پڑھنے والوں کو کس قسم کا پیغام دیتا ہے؟۔۔۔نتیجہ یہ کہ اس کی تحریروں کے قبول عام کے باوجود جبران کی شخصیت اور اس کے ادب پر ایک دھندسی

* شعبہ عربی، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

چھائی ہوئی لگتی ہے اور لوگ اس بحث میں پڑے بغیر کہ اس کا فکری وتصوراتی نظام کیا ہے اور عربی اور عالمی ادب میں اس کا مقام کہاں متعین ہوتا ہے اسے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔

جبران خلیل جبران کئی حیثیتوں سے مشہور ہے۔ وہ شاعر بھی تھا۔ افسانہ نگار بھی اور داناؤں اور مفکروں کے لہجے میں بات کرنے والا ایک قلمکار بھی، اور ان سب کے علاوہ وہ ایک اچھا خاصا مصور بھی تھا۔ ادب وفکر کے میدان میں جبران نے اپنا تخلیقی عمل دو زبانوں میں انجام دیا، ایک عربی اور دوسرے انگریزی میں۔ ۱۹۰۲ء میں امریکہ جا کر بسنے کے بعد پہلے چودہ پندرہ برس اس نے جو کچھ بھی لکھا اپنی مادری زبان عربی میں لکھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء سے وہ براہ راست انگریزی میں لکھنے لگا اور ۱۹۳۱ء میں اپنی موت تک کے اس تیرہ سالہ عرصے میں اس نے کم وبیش آٹھ کتابچے انگریزی زبان میں تصنیف کئے۔ ان میں سے ایک کتاب The Prophet ہے جو ۱۹۲۳ ء میں شائع ہوئی اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۹۸۵ء تک دنیا میں اس کے دس لاکھ نسخے فروخت ہو چکے تھے۔ اب تک اس کتاب کی اشاعت اگر بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ اس کتاب کی ہر دلعزیزی اس سے بھی ظاہر ہے کہ اردو میں اس کے تین ترجمے ہوئے۔ پہلا قاضی عبدالغفار کا ''اس نے کہا'' کے عنوان سے دوسرا خلیل صحافی کا۔ ''مسائل حیات'' کے نام سے، اور تیسرا ترجمہ جو یہاں زیادہ متداول ہے ہمارے دوست اور ''فنون'' کے سابق مدیر معاون حبیب اشعری دہلوی کا ہے جس کا عنوان انہوں نے اصل عنوان کی مطابقت میں ''النبی'' ہی رکھا۔

جبران کی تقریباً سولہ تصانیف میں سے نصف عربی زبان میں ہیں اور اتنی ہی انگریزی زبان میں، اور یہ سب کی سب قاضی عبدالغفار، خلیل صحافی، بشیر ہندی اور حبیب اشعر دہلوی کی کاوشوں کے طفیل اردو زبان میں منتقل ہو چکی ہیں، اور کتابوں کی دکانوں میں ہمیشہ سے بک رہی ہیں اور پڑھی جا رہی ہیں۔ ویسے اس کا حلقہ قارئین مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ پشاور سے لے کر کراچی اور آگے مغرب میں دنیا کے آخری سرے یعنی امریکی ریاست کیلفورنیا تک کتابوں کی دکانوں میں جبران کو شیلفوں پر سجے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ عرب دنیا کے کسی بھی ادیب یا مصنف کو غیر عرب دنیا میں اتنی شہرت اور پذیرائی حاصل ہوئی ہو جتنی جبران خلیل کو ہوئی ہے۔ اتنے ہر دلعزیز اور بے حد پڑھے جانے والے (Best seller) مصنف کے فکر وفن کے بارے میں کیوں نہ آج ہم تھوڑی سی گفتگو کر لیں، اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اور اگر ہو سکے تو اس راز پر سے بھی پردہ اٹھائیں کہ اتنے عرصے سے اگر وہ مختلف ملکوں اور متعدد زبانوں میں پڑھا جا رہا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے! یہ گفتگو ہم اس کی زندگی کے حالات سے شروع کریں گے اور پھر بات سے بات نکلتی چلی جائے گی۔

جبران اصلاً ایک عرب تھا جو ۱۸۸۳ء لبنان کے ایک گاؤں بشری میں پیدا ہوا جس میں وہ جنگلات آج بھی موجود ہیں ''جن کے مقدس صنوبروں کی لکڑی سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم میں اپنا معبد تعمیر کرایا تھا۔'' لبنانی رواج کے مطابق بچے کا نام اس کے دادا کے نام پر جبران رکھا گیا۔ (اس کے باپ کا نام خلیل تھا)

اور مارونی کلیسا' میں اسے بپتسمہ دیا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک طرف تو ترکی خلیفہ سلطان عبدالحمید کی آمرانہ حکومت شام ولبنان میں تعلیم یافتہ اور آزادی پسند طبقوں کے لئے زندگی مشکل کئے دے رہی تھی' اور دوسری طرف تجارتی میدان میں اہل یورپ چھانے لگے تھے۔ اور مقامی لوگوں کے لئے رزق کی راہیں روز بروز تنگ ہونے لگی تھیں۔ حالات کی اس ناسازگاری سے عاجز آ کر شام ولبنان میں رہنے والے بہت سے افراد نے جن میں ادباء اور شعراء بھی شامل تھے' اپنے وطن سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو مصر میں رک گئے۔ باقی لوگوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور آگے امریکہ کی طرف نکل گئے۔ اس دوسرے گروہ میں جبران خلیل جبران بھی ابھی بارہ برس کا لڑکا ہی تھا کہ ۱۸۹۵ء میں اپنی بیوہ ماں' دو بہنوں اور ایک سوتیلے بھائی کے ساتھ بوسٹن میں جا آباد ہوا۔

امریکہ میں وہ کوئی تین سال ہی رہا ہوگا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کی عربی تعلیم ناقص رہ گئی ہے۔ چنانچہ وہ بیروت واپس آ گیا اور یہاں کے مدرسۃ الحکمت میں عرب اور فرانسیسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور تقریباً پانچ سال بعد ۱۹۰۲ء اس نے لبنان کو دوسری مرتبہ خیر باد کہا۔ اس وقت اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ اور اپنے وطن سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہے اور کبھی لوٹ کر آئے گا۔ وہ ایک دفعہ پھر بوسٹن آ گیا۔ یہاں پانچ سال رہنے کے بعد اس کے سر میں مصوری سیکھنے کا سودا سمایا' اور شوق کی تکمیل کے لئے اس نے پیرس کی فنون لطیفہ کی اکادمی میں داخلہ لیا اور تین برس میں مشہور سنگ تراش روداں (Rodin) کی زیر نگرانی مصوری کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اسی زمانے میں وہ ایک صدی پہلے کے انگریز شاعر ولیم بلیک سے بھی متعارف ہوا اور عام خیال یہ ہے کہ اس کی شاعری اور مصوری نے اور اس کے ساتھ مفکر نطشے کی خیالات ونظریات نے اس ابھرتے ہوئے شاعر اور فنکار پر گہرا اثر ڈالا۔ پیرس سے واپس آ کر جبران نے نیو یارک میں رہائش اختیار کی اور ۱۹۳۱ء میں اپنی موت تک وہ اسی شہر میں رہا۔

جبران اور اس کے ساتھ بہت سے لبنانی عرب اپنے وطن سے ہجرت کرنے کو تو کر گئے اور امریکہ جا کر بس بھی گئے۔ لیکن یہاں پہنچ کر اگر انہوں نے ایک طرف آزادی اور زندگی کے کھلے پن کی صورت میں بہت کچھ پایا تو دوسری طرف بہت کچھ کھویا بھی۔ اتنی دور واقع ایک بالکل نئی دنیا اور اسکے بالکل اجنبی اور بے مروت ماحول میں جا کر انہیں اپنا وطن بری طرح یاد آنے لگا' جو اس زمانے کے سمندری سفر کے وجہ سے ایک ستارے کی طرح دور لگتا تھا۔ اپنی زمین اور اس کی باس' اس کے قدرتی مناظر' اپنی زبان' اپنی تہذیب اور شہر کی گلیوں اور محلوں میں اپنی بولی بولنے والے لوگ ـ ـ ـ ـ ان سب کی جدائی نے ان کے اندر ایک عجیب اداسی اور ناسٹلجیا پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس کا کسی حد تک مداوا کرنے اور اپنا عربی تشخص برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے وہاں اپنی ایک ادبی انجمن قائم کی اور عربی زبان میں کچھ اخبار اور رسالے نکالے۔ جن میں مہاجر برادری کے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ نظم ونثر میں ان کی ادبی تخلیقات بھی شائع ہونے لگیں۔

شمالی اور جنوبی امریکہ میں جا بسنے والے ان آٹھ یا دس ادباء اور شعراء نے عربی زبان میں جو ادب ان

حالات میں تخلیق کیا اس کا ذائقہ بالکل نیا اور اس وقت کی عام عرب شاعری سے کافی مختلف تھا۔ یہ ادب چونکہ مقدار میں بھی اچھا خاصا تھا اس لئے اس کا الگ ایک نام پڑا۔ ادب المہجر (ہجرت کے دیس کا ادب) اور معاصر ادب کے تذکروں میں اس کے لئے ایک الگ باب باندھا جانے لگا' اور شعراء المہجر (پردیسی شاعری) کی اصطلاحیں استعمال میں آنے لگیں۔

مہجری ادباء کے اس حلقے کا سرخیل کوئی شک نہیں جبران خلیل جبران ہی تھا اور اسی نے اپنے خیالات وافکار سے ان لوگوں میں ایک روح پھونک دی تھی اور ان کے اندر ادب وشعر کی نئی راہوں پر آگے بڑھنے کا ولولہ پیدا کیا تھا۔لیکن ایک حیران کن بات یہ ہے، کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کا اپنا ادبی جوہر (Talent) ان سب سے کم تر درجے کا تھا۔ مثلاً اس حلقے کا ایک شاعر ایلیا ابو ماضی آج بھی صف اول کے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شاعر نسیب عریضہ اور رشید ایوب دونوں اس دور میں اپنے اپنے انداز کے اچھے شاعر تھے، جبکہ ان کے مقابلے میں جبران خلیل جبران کی شاعری موضوع اور ہیت کے اعتبار سے اس وقت نئی اور مختلف تو ضرور تھی، لیکن زبان وبیان کے اعتبار سے خاصی کمزور تھی، جبران کو عربی پر کوئی زیادہ عبور حاصل نہیں تھا۔ اس پر جب اس نے جانتے بوجھتے روایتی اسالیب اظہار سے اجتناب برتا تو نتیجتاً ایک ایسی شاعری وجود میں آئی جس میں حسن بیان اور بلاغت اظہار کا دور دور پتا نہیں چلتا۔۔۔۔ اسی طرح نثر میں جبران کا دوست اور سوانح نگار میخائل نعمیہ ایک اعلیٰ درجے کا ادیب تھا۔ اپنے زمانے کی عربی ادب کی تنقید پر اس نے ''الغربال'' (چھلنی) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو بجا طور پر عربی میں جدید تنقید کا نقطہ آغاز قرار دی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ایک صفحے کا ایک مختصر مقالہ بھی ہے جس کا عنوان ہے۔ ''فلنترجم'' (تو آیئے ہم ترجمہ کریں) یہ اس وقت کے عرب ادباء کو اس امر کی دعوت تھی کہ بجائے اپنی محدود دنیا میں مگن رہنے کے وہ عالمی ادب کی بہترین تخلیقات کا ترجمہ کرکے انہیں عرب قارئین کے سامنے پیش کریں تاکہ اس طرح نہ صرف قارئین کا بلکہ عرب اہل قلم کا بھی ذہنی افق وسیع اور وہ مغربی معیاروں کو سامنے رکھ کر بہتر ادب پیدا کرنے کے قابل ہو۔لیکن اس کے مقابلے میں نثر میں جبران نے جو کچھ لکھا وہ اس اعتبار سے ضرور قابل توجہ تھا کہ اس کے موضوعات نئی قسم کے تھے اور بات کہنے کا انداز ایسا تھا جو عرب قارئین کے لئے انوکھا اور غرابت آمیز تھا لیکن جہاں تک اس کی نثر کا تعلق ہے وہ کچھ ناہموار اور بے کیف سی چیز نہیں تھی اور کسی طرح بھی اس قابل نہیں تھی کہ اسے جدید عربی نثر کے عمدہ نمونوں کے مقابل رکھا جا سکے۔ (۳)

لیکن اس کی شخصیت کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا، اور وہ ہے اس کا خاص رویا (Vision) اس کی انقلابی سوچ اور اپنے عہد کے مذہبی، سماجی اور تہذیبی سانچوں کے خلاف اس کی مکمل بغاوت! یہی وہ روح تھی جو جبران نے اپنے مہجری حلقے کے ادباء میں پھونکی تھی اور اس کے طفیل ان کی ادبی اور سعری کاوشوں کے لئے ایک سمت مہیا کر دی تھی جس میں انہیں ایک داعیانہ (missionary) جذب کے ساتھ آگے بڑھنا

تھا۔ چناچہ مہجری ادب اور شاعری جس نے دیکھتے ہی دیکھتے عرب دنیا میں اپنی الگ پہچان کرالی تھی اس کی زیریں لہر میں جبران کی یہی انقلابی روح کارفرما تھی۔

اس صدی کی پہلی دو تین دہائیوں میں لبنان اور دوسرے عرب ممالک میں مذہب، معاشرت اور علم و ادب پر قدیم روایات اور موروثی اقدار کا کافی تسلط تھا جس کی وجہ سے عام حالات میں ان سے انحراف کرنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جبران خلیل جبران، جس کی اُٹھان ایک خیال پرست اور خواب دیکھنے والے نوجوان کی صورت میں ہوئی تھی اس نے جلد ہی یہ محسوس کرلیا کہ اپنے مزاج کی خاص افتاد کی وجہ سے اس کے لئے ان پرانی بندشوں کا قیدی بن کر رہنا ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کی روح ان سے آزاد ہونے کے لئے پھڑ پھڑانے لگی۔ پھر جب سیاسی اور معاشی حالات کی ناسازگاری نے ان علاقوں کے لوگوں کی زندگی اور بھی مشکل بنادی تو جبران اور اسکی طرح کے دوسرے لوگوں نے وطن سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور سات سمندروں کا سفر اختیار کرکے شمالی اور جنوبی امریکہ میں جابسے، مغربی دنیا کے کھلے ماحول میں پہنچ کر ان لوگوں نے سکھ کا سانس لیا اور پہلی دفعہ آزادی کے مفہوم سے آشنا ہوئے۔ امریکہ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان کے دل میں یہ خیلا راسخ ہوا کہ انسان اس دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے اور کسی کو بھی، چاہے وہ کوئی فرد ہو، ادارہ ہو یا تنظیم، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی زندگی کے لئے حدود اور ضابطے مقرر کرے۔ جبران اور اس حلقے کی یہ بغاوت مذہب کے خلاف بھی تھی۔، معاشرتی رسوم اور طور طریقوں کے خلاف بھی اور ادب وشعر کی روایتی صورتوں کے خلاف بھی۔ (۴)

جبران خود ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام سے اسے گہری عقیدت تھی۔ لیکن مذہب کی بنیاد پر وہ انسانوں میں تفریق کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے خیال میں سارے مذاہب صحیح اور برحق تھے۔ اس کے نزدیک ساری اہمیت انسان اور اس کے روحانی وجود کی تھی، چاہے اس کی پرداخت کسی بھی مذہب میں ہوئی ہو۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے۔ احبک یا اخی ساجدأفی جامعک راکعافی ھیکلک ومصلیافی کنیستک فانت وأنا ابناء دین واحدھوالروح (میرے بھائی تم چاہے مسجد میں سجدہ کرو یا کسی ہیکل میں جاکے رکوع کرو یا کسی گرجے میں عبادت کرو، میں تم سے محبت ہی کروں گا، اس لئے کہ تم اور میں ایک ہی مذہب سے جڑے ہوئے ہیں اور وہ مذہب ہے) روح کا مہجری حلقے کا ایک شاعر کہتا ہے۔

اصلی لموسی، واعبدعیسی فاصدواتلوالسلام علی احمد

(میں موسیٰ علیہ السلام پر صلوات بھیجتا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جھکتا ہوں اور احمد پر درود وسلام پڑھتا ہوں)

جبران کا یہ نظریہ ظاہر ہے نہ مسیحی لوگوں کے لئے قابل قبول تھا اور نہ اسلام کے ماننے والے اسے پسند کر سکتے تھے چنانچہ ہر طرف سے اسے طعن وتشنیع کا نشانہ بننا پڑا اور مذہب کے معاملے میں اسے کافر اور بے دین قرار دیا

گیا۔(۵)

کسی قوم کی معاشرتی زندگی اس کے مذہب اور مقامی رسموں اور رواجوں کے تابع ہوتی ہے۔ جبران جب مذہب کے معاملے میں اتنا آزاد خیال تھا تو وہ معاشرے پر اسکی عائد کردہ پابندیوں کو کیسے قبول کر سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صدیوں پرانے طور طریقوں نے انسان کی آزادی کو کچل کر رکھ دیا ہے اور اسے اس مسرت اور سعادت سے محروم کر دیا ہے۔ جو اسے اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی۔''آزادی'' کے علاوہ ''محبت'' ایک ایسی قدر تھی جس کے اس نے اپنی تحریروں میں سب سے زیادہ گن گائے۔ محبت جو قوموں کے درمیان ہو' مذاہب کے درمیان ہو' افراد کے درمیان ہو' یا ایک مرد اور عورت کے درمیان ہو! اس آخری قسم کی محبت کے موضوع پر اس نے کئی کہانیاں بھی لکھیں۔ اس کا خیال تھا کہ عورتوں پر مردوں کے جبر و تسلط کا کوئی جواز نہیں۔ وہ مردوں کی طرح معاشرے کا اہم فرد ہوتی ہیں۔ اور ان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ مردوں کی طرح انہیں بھی تعلیم دی جائے اور زندگی میں ان کے لئے گھر سے باہر کام کرنے اور اپنی روزی کمانے کے اتنے ہی مواقع حاصل ہوں جتنے مردوں کو ہوتے ہیں' اور انہیں نہ صرف اپنا طرزِ حیات بلکہ شریک حیات منتخب کرنے کا بھی حق حاصل ہونا چاہے اور اس میں ان کے والدین یا دوسرے اہل اختیار کے لئے ان پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔۔۔۔ آج کے زمانے میں جبکہ ہر طرف عورت اور مرد کی مساوات کا چرچا ہے اور feminist تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں' جبران کے یہ کیالات شاید زیادہ انقلابی نہ لگیں' لیکن آج سے ستر یا اسی برس پہلے عورت کی آزادی پسند تھا کہ اس کے نزدیک اس میں کوئی مضایقہ نہیں تھا۔ کہ ایک عورت کی شادی اگر اس کے محبوب کی بجائے کسی ناپسندیدہ مرد سے ہو جاتی ہے تو وہ شادی کے بعد چوری چھپے اپنے محبوب سے ملتی رہے۔ اس کا ایک عرب ناول الاجنحۃ المتکسر ۃ (ٹوٹے ہوئے پر) جس کی پیچھے دراصل اس کی اپنی ناکام محبت کا تجربہ تھا' اسی موضوع پر ہے' اور اسکی کہانی یہ ہے کہ ایک لڑکی ایک نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ جسے اس کا باپ بھی پسند کرتا ہے۔ لیکن حالات سے مجبور ہو کر اس کا باپ اسکی شادی' اس کی مرضی کے خلاف' ایک اسقف (Bishop) کے بد کردار بھتیجے سے کر دیتا ہے۔ تاہم یہ محبت کرنے والا جوڑا لڑکی کی شادی کے بعد بھی' چھپ چھپ کر ایک گرجے میں ایک دوسرے سے ملتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی ملاقاتوں کی بھنک لوگوں کے کانوں میں پڑ جاتی ہے اور ان پر ہر طرف سے انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ حالات سے خوفزدہ ہو کر یہ بیچارے آئندہ کبھی نہ ملنے کا عہد کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ پانچ سال بعد لڑکی ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے اور حالت زچگی میں وہ خود بھی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ آخری وقت میں وہ اپنے بچے کو خطاب کرتے ہوئے کہتی ہے۔

> ''تو تم مجھے لینے آئے تھے۔ میرے لال! مجھے اس اذیت بھری قید سے نجات دلانے' مجھے وہ راستہ دکھانے آئے تھے جو آزادی کے ساحل تک جاتا ہے''(۶)

جبران کے اس ناول میں پر جہاں تعریفی تبصرے ہوئے وہاں بہت سے لوگوں نے اس پر یہ اعتراض بھی کیا کہ اس میں جبران نے عائلی زندگی کے تقدس کا مذاق اڑایا ہے اور نوجوان نسل کو یہ حوصلہ دلایا ہے۔ کہ وہ شادی ہو کر بھی قبل از ازدواج معاشقے جاری رکھ سکتے ہیں۔

جبران کی انقلابی فکر کا تیسرا ہدف اس صدی کے اوائل میں مروج شعری روایات تھیں۔ جبران اور اس کے ساتھ اس کے حلقے کے لوگوں کو سب سے پہلے عربی ادبیات کے کلاسیکی سانچوں پر اعتراض تھا۔ فصاحت وبلاغت اور زبان ومحاورے کی صحت کا ''غلامانہ'' التزام' تحریر کی آرائش کے لئے تشبیہ' استعارے کنایے' تجنیس وغیرہ کا استعمال' ان لوگوں کے لئے یہ ساری تدابیر غیرضروری تھیں۔ جبران کا خیال تھا کہ انسان اگر نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو بالکل راست طریقے پر ہونا چاہئے۔ اس کے لئے عربی کے کلاسیکی اور روایتی اسالیب کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح اس وقت کی عربی شاعری پر اس کا اور اس کے حلقے کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ ابھی تک گھسے پڑے موضوعات کی اسیر چلی آتی ہے۔ مثلاً امراء اور سیاسی ومذہبی اکابر کی مدح سرائی' کسی قومی یا سیاسی واقعے پر ردعمل کا اظہار' کسی بچے کی پیدائش پر پیغام تہنیت' ایک دوسرے کی ہجو اور عتاب وغیرہ! ان کا خیال تھا کہ شاعری کو انسان کے اندرونی جذبات اور خالص احساسات کا ترجمان ہونا چاہئے۔ مثلاً محبت کے ایک ایسے تجربے کا بیان جو انسان کی پوری شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہو' وطن اور اہل وطن کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار' کسی انفرادی یا اجتماعی المیے کی داستان' فطرت کے ساتھ یگانگت اور اس کے مناظر کی تصویرکشی وغیرہ! اور جب مہجری شعراء کے اس نئے انقلابی رجحان کے نتیجے میں شاعری کے موضوعات بدلے تو قدرتی طور پر شاعری کا اسلوب اور لہجہ بھی بدلا۔ چنانچہ دیکھا گیا کہ ان کے ہاں شاعری کا وہ پہلے والا بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز ختم ہوا اور اس کی جگہ ایک نرم' دھیمی اور نیچے سروں والی شاعری نے جنم لیا۔ ایسی شاعری جس میں لگتا تھا جیسے شاعر اپنے آپ سے یا اپنے کسی دوست یا ہمزاد سے سرگوشی میں ہم کلام ہے۔ عربی ادب، کے ایک موقر نقاد محمد مندور بجا طور پر مہجر کی اس شاعری کو الشعرالمھموس (سرگوشی کی شاعری) کا نام دیا۔ شاعری کے باب میں اس نئے اندازِ نظر کے ساتھ جب ان لوگوں نے قدیم شعری روایت پر نگاہ ڈالی تو انہیں دورِ عباسی کے صرف ان شعراء میں دلچسپی پیدا ہوئی جن کا میلان شاعری میں فکر وفلسفہ کی طرف زیادہ تھا۔ چنانچہ ابوالعلاء معری ان کا سب سے پسندیدہ شاعر ٹھہرا اور اس حلقے کے اپنے ایک شاعر امین الریحانی نے اس کے دیوان ''لزومیات'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح انہیں فارسی کا عمر خیام بھی اچھا لگا کہ وہ اپنی رباعیوں میں فلسفہ زندگی کی بات کرتا تھا اور بوعلی سینا کی روح کے بارے میں ایک نظم بھی ان کی توجہ کا مرکز بنی۔

مہجر کے ادباء کی شاعری اس اعتبار سے ایک بڑا انقلاب لائی کہ عربی کی کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی شعری روایت میں ہم پہلی بار یہ دیکھتے ہیں کہ ایک نظم میں مرکزی حیثیت مضمون اور خیال کو حاصل ہے اور زبان وبیان اور

لفظ ومحاورے کی حسن کاری کی اہمیت ثانوی رہ گئی ہے۔ بلکہ بعض شعراء کے ہاں اور سب سے یادہ خود جبران کے ہاں اس کی کوئی زیادہ اہمیت باقی ہی نہیں رہتی۔ عربی شاعری کی نسبت سے یہ بے شک ایک انقلابی نظریہ تھا۔ جس کا سہرا ایک بار پھر جبران خلیل کے سر باندھتا ہے۔ اس نظریے کے اثرات معاصر شاعری پر نیز بعد میں آنے والے شعراء پر یہاں وہاں ضرور دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن مہجر کے ان انقلابی شعراء کی تخلیقات ایک دو شاعروں کی چھوڑ کر فن کا کوئی ایسا اعلیٰ معیار پیش نہ کرسکیں کہ وطن عربی میں رہنے والے شعراء کے لئے نمونہ ومثال کا کام دیتیں اور الشعرا لمہجری کے اثرات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا۔ اُدھر یہ ہوا کہ دو عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں وقت اور حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے زیر اثر سب عرب ممالک میں شاعری کے موضوعات اور مضامین میں ایک نمایاں تبدیلی آتی چلی گئی اور اس میں زبان کے کلاسیکی نمونوں کے احیاء کے ساتھ ساتھ فکر واحساس کا عنصر بھی زیادہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں مصر وشام اور لبنان وعراق سے تعلق رکھنے والے ایسے شعراء ہمارے سامنے آتے ہیں جو ہر اعتبار سے اہم اور قد آور تھے۔ احمد شوقی، حافظ ابراہیم اور خلیل مطران جیسے لوگون کی شاعری میں فکر وخیال اور جذبے اور احساس کی توانائی تو ہے ہی اس کے ساتھ اُس میں زبان وبیان کا بھی ایسا اعلیٰ معیار دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ دور عباسی کے اکابر شعراء کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ان لوگوں کے شعری جینئس کے سامنے مہجر کے شعراء کم مایہ اور اوسط درجے کی چیز (mediocre) دکھائی دیتے ہیں۔ مہاجر شعراء کی نئی سوچ اور انقلابی نظریہ اپنی جگہ لیکن اگر وہ ''لفظ'' کی اہمیت سے اتنا اعراض نہ برتتے اور بلاغت اظہار کی سحر آفرینی سے آنکھیں بند نہ کرلیتے تو ان کے شعری نظریات زیادہ مقبول اور ان کے اثرات بہت دوررس ہوتے۔ (۷)

شاعری میں جبران خلیل کی نظم ''المواکب'' (قافلے) اور نثر میں اس کی کتاب '' The Prophet'' (النبی) کے بارے میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ ایک لحاظ سے یہ دونوں اسکی نمائندہ تخلیقات قرار دی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جبران کے ان دونوں شاہکاروں کا ایک مختصر سا جائزہ یہاں پیش کردیا جائے۔

نظم ''قافلے'' اپنی ہئیت میں یقیناً جدید ہے اس لئے کہ اس میں شاعر نے ایک ہی قافیے کا التزام نہیں کیا بلکہ نظم کے مختلف بندوں (Stanzas) میں یہ قافیہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ اپنے خیالات اور موضوعات میں یہ نظم فلسفیانہ ہے جس میں شاعر مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی امور سے بحث کرتا ہے مثلاً خیر وشر کا مسئلہ روح اور جسم کا رشتہ مسرت کی حقیقت کیا ہے؟ معاشرتی اور سیاسی تنظیمیں کیوں ہیں۔ اور کیسی ہیں!!! انسان نے انسان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہے وغیرہ اور اس نظم کے سارے فلسفے کا لب لباب یہ ہے کہ اے انسانو! آؤ ہم فطرت کی طرف واپس چلیں اور س زندگی کے فتنہ وفساد اور ہنگاموں کو چھوڑ کر ''جنگل'' کی راہ لیں۔ عربی میں وہ اس کے لئے الغاب کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ جس کے معنی جنگل اور بیابان کے ہیں۔ نظم کا عنوان ''قافلے'' اس مناسبت سے ہے کہ

ایک بند کے بعد دوسرے بند میں انسانیت کی اس ساری جدوجہد اور تگ وتاز کی تصویر پیش کی گئی ہے جو وہ مسرت کی تلاش میں ازل سے چلی آ رہی ہے لیکن ہمیشہ صحیح راستے سے بھٹکی ہی رہی ہے'اس لئے کہ صحیح راستہ تو وہی ہے جو فطرت کی طرف یا دوسرے الفاظ میں ''جنگل'' کی طرف جاتا ہے۔ زندگی کی کشاکش سے دور ایک پرسکون گوشہ امان کی جانب!۔۔۔زندگی کا یہ پرسکون گوشہ امان بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ مجھے بھی مطلوب ہے اور یقیناً آپ کو بھی مطلوب ہوگا۔لیکن یہ ہے کہاں؟اور کیا آج کی زندگی میں کہیں کوئی ایسا گوشہ موجود ہے جہاں ہماری رسائی ہو سکے ؟یہ سوال جبران کے زمانے میں بھی شاید اُٹھا ہو'لیکن آج کی دنیا میں تو یہ سوال بالکل بنیادی اور برمحل ہے۔ اس اعتبار سے یہ نظم اپنے پیغام میں سراسر رومانی ہے اور زندگی کے بارے میں ایک بالکل ہی سادہ اومبتدیانہ فلسفہ پیش کرتی ہے۔ نظم کے آغاز میں ایک بگڑے ہوئے انسانی معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔جس میں ہر طرف ظلم اور بے انصافی کا راج ہے۔ انسان آقاؤں اور غلاموں اور حاکموں اور محکوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تقابل کے طور پر فطرت کا بیان ہوتا ہے۔ جس میں تمام جاندار برابر ہوتے ہیں اور ان میں آقا اور غلام اور حاکم ومحکوم کی تفریق دیکھنے میں آتی۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ فطرت کی اقلیم اگر ''جنگل'' ہے تو اس کا قانون تو یہ ہے کہ ہر چھوٹا جاندار اپنے سے بڑے اور طاقتور جاندار کی خوراک بنتا ہے۔ ایسا جنگل (الغاب) اس ارضی اور حقیقی دنیا میں کہاں واقع ہے۔ جہاں شیر اور ہرن امن وآشتی کے ساتھ اکٹھا رہتے ہوں گے۔ جہاں عقاب فاختہ پر نہیں جھپٹتا ہوگا اور شارک مچھلی چھوٹی مچھلیوں سے تعرض نہیں کرتی ہوگی!۔۔۔بہرحال شاعر اپنی نظم کے ہر بند میں انسانی معاشرے کی المناک خامیوں اور کوتاہیوں'اور اس کے مقابلے میں فطرت کی کامل اور اکمل حالت کا خوبصورت نقشہ کھینچتا چلا جاتا ہے جہاں خیر وشر محبت اور نفرت' روح اور جسم' روشنی اور ظلمت اور ایمان اور کفر کے درمیان کوئی جنگ اور پیکار نظر نہیں آتی حتیٰ کہ جہاں موت اور حیات جاوداں بھی ایک دوسرے سے مختلف دکھائی نہیں دیتیں۔ شاعر کے نزدیک ایک انسان جو فطرت کی آغوش میں زندہ رہنے کا خواب دیکھتا ہے ایک طرح سے پیغمبر ہی ہے۔(۸)

فان رایت اخاالاحلام منفرداً
عن قومہ وھو مبنو ذ ومحتقر
فھو النبی وبردا الغیب یحجبہ
عن امۃ برداء الامن تأتزر
وھو الغریب عن الدنیا وساکنھا
وھو المجاھر لام الناس اوعذروا

''پس تو اگر خواب دیکھنے والا کوئی ایسا شخص پائے جو اپنے لوگوں سے الگ تھلگ ہو اور ان کی حقارت کا نشانہ بنا ہو۔ تو سمجھ لو کہ وہ نبی ہے اور آنے والے کل کی چادر نے اسے یوں ڈھانپ رکھا ہے کہ اس کی عافیت پسند قوم اسے دیکھ نہیں پا رہی۔ وہ اس دنیا میں

رہتے ہوئے بھی اجنبی ہے اور لوگ چاہے اسے ملامت کریں یا چھوڑ دیں وہ اپنی بات کہہ کے رہتا ہے۔''(۹)

چنانچہ جبران اپنی اس نظم میں تمدنی زندگی کے مسائل اور پیچیدہ گیوں سے بغاوت کر کے انسان کو اس قدیم سادگی اور ابتدائی معصومیت کے دور کی طرف واپس لے جانا چاہتا ہے جہاں سے اس نے تہذیب و عمران کی طرف قدم بڑھایا تھا۔

جبران کی نظم ''المواکب'' کا شعری نمونہ:

احن الی الغاب حیث الشرور

ھنا لک نیرانھا خامدۃ

احن الی حیث لا تجلس الغدر

قرب الوفاء الی المائدۃ

''مجھے اس جنگل کی آرزو ہے جہاں فتنوں کی آگ بجھی ہوئی ہے۔'' (جنگل میں فتنے تھے ہی کب کہ ان کی آگ اب بجھی ہوئی ہے)

''مجھے ایسے جہاں کی آرزو ہے جہاں غدرای اور وفاداری ایک دسترخواں پر جمع نہیں ہوتے''

اس طرح کے اشعار کو سامنے رکھیں تو مہجر کے شعراء کے بارے میں طہٰ حسین کی یہ رائے سب سے زیادہ خود جبران خلیل جبران کے بارے میں صحیح لگتی ہے کہ

''ان لوگوں کا ذہن زرخیز ہے' ان کے اندر جو ہر بھی ہے۔' ان کے تصور کی پرواز بھی دور تک ہے اور ان میں اچھا شاعر بننے کے سارے لوازم موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے اس ''وسیلے'' (یعنی لفظ) میں کوئی مہارت پیدا نہیں کی جس کے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ یا تو وہ عربی زبان سے نابلد ہیں۔ یا پھر انہوں نے جان کر اسے نظر انداز کیا ہے۔ اور اس معاملے میں اپنی کوتاہی کو ایک ''جدید اسلوب'' کا نام دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔''(۱۰)

جبران خلیل جبران کا دوسرا شاہکار انگریزی میں لکھی ہوئی اس کی طویل کہانی The Prophet (النبی) ہے جو عالمی سطح پر بہترین بکنے والی کتابوں (Best sellers) میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ المصطفیٰ نامی ایک حکیم فرزانہ جو لوگوں میں محبوب بھی تھا اور منتخب بھی ''بارہ برس تک ایک شہر اور فالیس میں اپنے جہاز کا انتظار کرتا ہے۔ جسے ایک دن واپس آ کر اسے ایک چھوٹے سے جزیرے کی طرف لے جانا ہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ ایک زمانے کے بعد ایک دن انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی ہیں اور وہ ایلول (ستمبر) کے ساتویں دن شہر کے باہر پہاڑی پر چڑھ کر سمندر کی طرف نظر کرتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا جہاز کہر کی دھند میں لپٹا چلا آ رہا ہے۔ وہ خوش

ہوتا ہے اور اس کے دل کے دروازے کھل جاتے ہیں لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر اُداس ہو جاتا ہے۔ ''میں یہاں سے مسرور اور بے غم کیونکر جا سکوں گا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔ اس لئے بارہ طویل برس اس نے شہر کی پناہ میں گزارے تھے اور دُکھ کے دن تنہائی کی راتیں کاٹی تھیں۔'' اور کون ہے جو اپنے دُکھ اور تنہائی سے رخصت ہو اور جب وہ شہر میں داخل ہوتا ہے تو سارے شہر والے اس سے ملنے نکل آتے ہیں اور شہر کے بڑے بوڑھے اس کی طرف بڑھ کے کہتے ہیں۔ اتنی جلدی ہم سے رخصت نہ ہو اس لئے کہ تو ہمارا چہیتا بیٹا ہے جس پر ہماری روحیں فریفتہ ہیں۔'' اسی طرح دوسرے لوگ، مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے سب اس سے ٹھہرنے کی التجا کرتے ہیں۔ پھر ہیکل کے ایک گوشے سے ایک کاہنہ نکلتی ہے جس کا نام المترا ہے۔ وہ اسے بڑی گرم جوشی سے سلام کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تمہیں ایک دن اپنے وطن پر لوٹنا ہوگا۔ سو ہم تمہارے قدموں کی زنجیر نہیں بن سکتے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اپنی روانگی سے پہلے تو ہم سے چند باتیں کر لے۔ چنانچہ اب شہر کے لوگ باری باری اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ ان کے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ سوالات کچھ اس طرح ہیں

☆ المترا نے کہا۔ ''ہمیں محبت کے متعلق کچھ بتا''

☆ المترا کا دوسرا سوال تھا۔ ''اور شادی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے میرے آقا!

☆ ایک عورت نے جو بچے کو چھاتی سے لگائے تھی کہا ''ہمیں بچوں کے متعلق کچھ بتا۔''

☆ پھر ایک کسان نے کہا۔ ہمیں غم اور خوشی کے بارے میں کچھ بتا''

اسی طرح کوئی چھبیس کے قریب موضوعات ہیں جن کے بارے میں لوگ سوال کرتے ہیں اور مرد دانا ان سب کا جواب دیتا ہے۔ یہ جواب جو اس زندگی کے گونا گوں مسائل و معاملات کے بارے میں دئے جاتے ہیں یہ جبران خلیل جبران کی فکر بھی ہے فلسفہ بھی ہے، ادب بھی ہے اور شعری اظہار بھی! یہ فکر و فلسفہ اور شعری اظہار کس انداز کا ہے اس کے کچھ نمونے یہاں دیکھتے چلتے ہیں۔

''المترا نے کہا ہمیں محبت کے متعلق کچھ بتا

اس نے اپنا سر اٹھایا اور لوگوں کی طرف دیکھا۔ مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی اور اس نے گہری آواز میں کہا۔ جب محبت تمہیں بلائے تو اس کے پیچھے جاؤ۔ اگرچہ اس کی راہیں کٹھن اور دشوار ہوتی ہیں، اور جب وہ تمہیں اپنے پروں میں لپیٹے تو خوشی سے لپٹ جاؤ، چاہے اس کے پروں میں چھپی ہو تلوار تمہیں زخمی ہی کیوں نہ کر دے اور جب وہ تم سے بات کرے تو اس کا یقین کرو، چاہے اس کی آواز تمہارے خوابوں کو مسمار ہی کیوں نہ کر دے، جس طرح بادِ شمال باغ کو اُجاڑ دیتی ہے۔۔۔۔''

کیا سمجھے؟ سوال محبت کے بارے میں تھا کہ یہ کیا بلا ہوتی ہے اور جواب یہ ملتا ہے کہ یہ بلا جب تم سے چمٹ جائے تو تمہیں چاہئے کہ ہتھیار ڈال دو اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو۔

''المترا کے ہونٹ دوبارہ جنبش میں آئے اور اس نے کہا: اور شادی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے

میرے آقا۔ اور اس نے جواب میں کہا۔ تم ایک ساتھ ہی پیدا ہوئے تھے اور ایک ساتھ ہی ہمیشہ رہو گے اور جب موت اپنے سفید پر پھیلا کر تمہاری خاکستر کو اڑا دے گی تو اس وقت تم ساتھ رہو گے ہاں تم ساتھ رہو گے۔ یہاں تک کہ اللہ کے گمبھیر حافظے میں بھی! لیکن تمہیں اپنے وصل میں کچھ فصل بھی رکھنا چاہئے تاکہ آسمان کی ہوائیں تم دونوں کے درمیان رقص کر سکیں۔ تم ایک دوسرے سے ضرور محبت کرو لیکن محبت کو زنجیر نہ بناؤ۔۔۔"

جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ شادی کی حقیقت اور اس سے وابستہ تصورات (Concepts) کا بیان نہیں ہے بلکہ شادی کو کامیاب اور دیرپا بنانے کے کچھ نسخے ہیں جو میرے خیال میں بہت صحیح اور کارآمد ہیں۔ مثلاً یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے کچھ عرصے کے لئے الگ بھی ہو جایا کریں تاکہ ہجر کے بعد جو وصل ہوتا ہے اس کا لطف اٹھا سکیں اور دوسرے یہ کہ محبت کے معاملے میں اپنے ساتھی کو آزاد چھوڑ دو اسے باندھ کر نہ رکھو اس کا دم گھٹنے لگے گا وغیرہ۔ جبران کے الفاظ میں ایک دوسرے کے ساتھ گاؤ ناچو اور خوشیاں مناؤ' لیکن ایک دوسرے سے آزاد بھی رہو'

"ایک عورت نے کہا: ہمیں غم اور خوشی کے بارے میں کچھ بتا۔

مصطفیٰ نے کہا: تمہاری خوشی تمہارا غم ہے جس کے چہرے سے نقاب اُٹھا دی گئی ہے وہی کنواں جس سے تمہارے قہقہے بلند ہوتے ہیں بسا اوقات تمہارے آنسوؤں سے لبریز ہوا ہے۔۔۔۔۔

تم میں سے بعض کہتے ہیں مسرت غم سے بہتر ہے اور بعض کہتے ہیں نہیں غم بہتر ہے۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ وہ ساتھ آجاتے ہیں۔ ان میں سے ایک جب تمہارے دسترخوان پر ہو تو یاد رکھو دوسرا تمہارے بستر میں ہوگا۔۔۔۔ یقین جانو ترازو کے پلڑوں کی طرح تم اپنی خوشی اور اپنے غم کے درمیان معلق ہو۔۔۔ اور زندگی کا خزانہ دار۔۔۔۔ خدا۔ اپنا سونا اور اپنی چاندی تولنے کیلئے تمہیں اٹھاتا ہے تو لازمی طور پر تمہاری خوشی غم یا تمھارے غم کے پلڑے جھک جاتے ہیں یا اُٹھ جاتے ہیں۔

"ایک شاعر نے کہا ہمیں حسن کے متعلق کچھ بتا۔

اور مصطفیٰ نے جواب دیا۔ تم حسن کو کہاں ڈھونڈو گے اور کیسے پاؤ گے' جب تک وہی تمہیں رستے میں نہ ملے اور تمہاری رہنمائی نہ کرے اور تم کیسے اس کی باتیں کرو گے جب تک وہی تمہاری گفتگو کا تانا بانا نہ بنے۔

نحیف اور درماندہ کہتا ہے حسن ایک دھیمی اور نرم و نازک آواز ہے جو ہماری روحوں سے سرگوشیاں کرتی ہے۔ رات کے وقت شہر کا چوکیدار کہتا ہے: حسن صبح کے ساتھ مشرق سے طلوع ہوگا اور دوپہر کے وقت مزدور اور مسافر کہتے ہیں: ہم نے اسے مغرب کے دریچوں سے زمین کو جھانکتے دیکھا ہے۔

ہاں یہ ساری باتیں حسن کے متعلق تم کہتے ہو لیکن یہ سچ ہے تم حسن کی بات ہی کب کرتے ہو؟ تم ان ضرورتوں کا ذکر کرتے ہو جو پوری نہیں ہوئیں اور حسن ضرورت نہیں' ایک کیف ہے۔۔۔۔

اے اور فالیس کے رہنے والو! حسن زندگی ہے۔ زندگی جو اپنے نورانی چہرے سے نقاب اُٹھا دے اور تم

زندگی ہواور تمہی نقاب!

حسن ابدیت ہے جو اپنا عکس اپنے آئینے میں دیکھتا ہے اور تمہی ابدیت ہو اور تمہی آئینہ۔''

اس طرح کی باتیں ہیں جو اورفالیس والوں کو اپنے سوالوں کے جواب میں اس حکیم فرزانہ سے سننی پڑتی ہیں۔

اب ہم اصل کہانی کی طرف واپس آتے ہیں۔ المصطفیٰ اور اہل اور فالیس کے درمیان جب سوال وجواب کا یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے تو وہ عبادت گاہ کی سیڑھیوں سے اترتا ہے اور اپنے جہاز کا رُخ کرتا ہے۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ وہ اپنے جہاز پر سوار ہوجاتا ہے اور اس کے عرشے پر کھڑے ہو کر مجمع پر دوبارہ نگاہ ڈالتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے اپنے اسی فلسفیانہ انداز میں ایک اور لمبی تقریر کرتا ہے اور آخر میں وہ لوگوں کو الوداع کہہ کے ملاحوں کو اشارہ کرتا ہے۔ ملاح اسی وقت لنگر اٹھا دیتے ہیں اور جہاز مشرق کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے اس موقع پر اختتامی جملے یہ ہیں۔

''لوگوں کی چیخیں بلند ہوئیں، گویا وہ ایک ہی دل سے اُٹھ رہی ہوں اور اول شب کی ظلمتوں کو چیرتی ہوئی سمندر کی سطح پر سے گزر گئیں۔ ایک المترا تھی جو خاموش کھڑی جہاز کو تکتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ کہر میں تحلیل ہوگیا۔ مجمع منتشر ہوگیا لیکن وہ دیر تک ساحل پر کھڑی رہی۔ اس کے دل میں جانے والے کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ ''ہاں چند ہی روز بعد جب میں ہوا کے دوش پر تھوڑی دیر آرام کر چکوں گا، ایک اور عورت مجھے اپنے گربھ میں پالے گی۔''

اصل انگریزی الفاظ یہ ہیں۔

A little while,a moment of rest upon the wind,and another woman shall bear me "

یہ جبران خلیل جبران کے اس شاہکار کے کچھ نمونے ہیں جس کے بیس لاکھ یا اس سے زیادہ نسخے اب تک دنیا میں فروخت ہو چکے ہیں اوپر کے یہ اقتباسات پڑھ کر یہ جان لینا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ جبران نے یہ کہانی نیطشے کے ''زرتشت نے کہا'' کو سامنے رکھ کر لکھی تھی۔ فرق یہ ہے کہ جہاں نیطشے کے ہاں فکر وفلسفے کی گہرائی ہے وہاں جبران کی کہانی پر رومانی طرز فکر اور جذبہ وشعریت کا غلبہ ہے۔

۔۔۔۔ یہ کہانی دراصل جبران جبران خلیل کا خواب تھی۔ اسے نیویارک میں رہتے ہوئے بارہ برس ہو چکے تھے جب اس نے The Prophet لکھی، اور اس کے دل کے نہاں خانے میں یہ اُمید ہمیشہ چٹکیاں لیتی تھی کہ کوئی سبب تو ایسا بنے گا کہ ایک دن غیب سے ایک جہاز نمودار ہوگا اور وہ اسے اپنے وطن واپس لے جائے گا۔ اپنے وطن لبنان کو لوٹنے کی خواہش کبھی اس کے دل سے جدا نہ ہوئی تھی۔ ''النبی'' کی اس غیر معمولی ہر دلعزیزی کے بارے میں سوچنے والوں نے بہت سوچا ہے، لیکن سوائے ایک دو باتوں کے اس کی کوئی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک تو یہ کہ ''النبی'' کا اسلوب اور اس کا انداز تکلم انجیل مقدس کے اسلوب پر ڈھالا گیا ہے۔ اس طرح کے پیغمبرانہ لہجے میں جب بھی بات کی جائے گی تو اس کا مضمون چاہے پامال ہی کیوں نہ ہو اس کا پڑھنے والے کے دل پر ایک

خاص اثر پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ کہانی رومان پسند اور خیال کی دنیا میں رہنے والے انسانوں کو اپنے دل کی بات لگتی ہے اور روزمرہ کی ارضی حقیقتوں کی تفسیر ایسے مبہم اور خواب ناک الفاظ میں کرتی ہے کہ انسان ان کی ظاہری دانائی اور نغمگی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس کہانی میں امید کا ایک اشارہ (note) بھی ہے کہ تمہاری زندگی میں انتظار کا عرصہ کتنا طویل کیوں نہ ہو ایک ایسا جہاز آئے جو تمہیں خوابوں کے جزیرے تک لے جائے گا۔(۱۲)

جبران خلیل کی زندگی میں کئی عورتیں آئیں۔ ان میں سے کم از کم پانچ ایسے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے ساتھ جبران کا کسی نہ کسی درجے میں جذباتی رشتہ استوار ہوا۔ لیکن صنف مخالف کے کسی فرد کے ساتھ بھرپور محبت یا جنسی تعلق کا کوئی نشان اس کی زندگی میں نہیں ملتا۔ سب سے پہلے اس کا جذباتی رشتہ لبنان کی ایک لڑکی ''حلا'' کے ساتھ قائم ہو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اپنی عربی استعداد کی تکمیل کے لئے امریکہ سے لبنان آیا ہوا تھا۔ جبران نے اس لڑکی کا رشتہ مانگا لیکن اسے انکار ہو گیا۔ اس طرح جبران کے دل پر وہ چوٹ پڑی جس نے اس سے الاجنحۃ المتکسر ۃ (ٹوٹے ہوئے پر) جیسی کہانی لکھوائی۔ جبران کی زندگی میں دوسری لڑکی فرانس کی ''میشیلن'' تھی۔ آپ نے اس کے ساتھ بھی اظہار عشق فرمایا لیکن اس تعلق کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات سامنے نہیں ہیں۔ تیسری لڑکی امریکہ کی ''میری میسکل'' تھی جسے جبران نے شادی کا پیغام دیا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ بیل بھی منڈیر نہ چڑھی۔ چوتھی لڑکی ایک لبنانی ادیبہ ''می زیادہ'' تھی۔ اس کے ساتھ جبران کی طویل خط و کتابت تو رہی لیکن وہ کبھی ایک دوسرے سے مل نہ پائے۔ جبران می کے نام اپنے خطوں میں محبت کا بہت ذکر کرتا ہے اور می سے ملاقات کی خواہش کا اظہار بھی کرتا ہے۔ جس کا تصور وہ اس طرح باندھتا ہے کہ ''کاش میں مصر میں یا اپنے وطن میں بیمار ہوتا کہ اس طرح اپنے پیاروں کے قریب تو ہوتا کیا تم جانتی ہو می کہ ہر صبح اور ہر شام میں اپنے آپ کو قاہرہ کے کسی گھر میں یوں لیٹا ہوا دیکھتا ہوں کہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو اور میرا تازہ مضمون پڑھ رہی ہو یا اپنی کوئی ایسی چیز مجھے سنا رہی ہو جو ابھی شائع نہیں ہوئی۔'' جبران کے سوانح نگار اس مخمصے میں مبتلا رہے ہیں کہ جب اس کے اور می کے درمیان ایسا گہرا جذباتی اور ذہنی رشتہ تھا جو اٹھارہ برس کے طویل مدت تک قائم رہا اور جس کا احوال ان کی مراسلت سے ملتا ہے تو انہوں نے اس سارے عرصے میں ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ پانچویں لڑکی جو جبران کی زندگی میں آئی وہ امریکہ کی ''باربرا ینگ'' تھی جو اس کی زندگی کے آخری سات برسوں میں اس کے بہت قریب رہی اور جس نے شہر شہر پھر کر اس کی کتابوں اور اس کے پیغام کو امریکی لوگوں تک پہنچانے کے لئے بڑا کام کیا۔ یہ لڑکی جبران کی مصوری کی بھی دلدادہ تھی اور جبران کی باتیں سننے اور اس کی تیمارداری کرنے کے لئے دن رات کا بڑا حصہ اس کے پاس گزراتی تھی۔(۱۳)

جبران طبعاً ایک رومان پسند اور تخلیل پرست انسان تھا، جو اس دنیا میں ہر طرف امن اور آشتی دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے اردگرد کی مشینی اور صنعتی زندگی میں جب اسے یہ سب کچھ نہیں ملتا تھا تو وہ انسانوں سے کہتا تھا کہ آؤ اس تمدنی زندگی کو چھوڑ کر ''جنگل'' کی طرف نکل جائیں، جہاں امن ہو گا اور کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ اس کے نزدیک

اس زندگی میں ''محبت'' کی بڑی قدر تھی۔اس موضوع پر اس نے بہت کچھ کہا اور کہانیاں بھی لکھیں' جن کا تانا بانا اس نے سراسر رومانی نقطہ نظر اور انسانی المیے سے ترتیب دیا۔ چنانچہ ان کہانیوں میں دکھ ہے' جدائی ہے' موت ہے' آنسو ہیں اور قبریں ہیں اور یہ باتیں نوجوان دلوں پر بہت اثر کرتی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جبران اس کے ساتھ ساتھ ایک صاحب رؤیا (Visionary) اور باغیانہ میلان رکھنے والا ایک مفکر بھی تھا۔ مذہب' معاشرت اور ادب وفن کے بارے میں اس نے ستر اسی برس پہلے جو نظریات پیش کئے اتنا زمانہ گزر جانے پر وہ آج بھی نئے اور انقلابی قرار پائیں گے۔مثلاً اس کا یہ قول کہ سب مذاہب سچے ہیں اور ان کی وجہ سے انسانوں میں تفریق نہیں کی جانی چاہئے' آج بھی ایسا ہے کہ بہت کم لوگ اسکی حمایت میں کھڑے ہونے کی جرات کر سکتے ہیں۔' جبران کے ان انقلابی نظریات کا عرب معاشروں پر اثر ضرور ہوا لیکن ایک محدود پیمانے پر! جبران کو اگر اس انقلابی سوچ کے ساتھ ساتھ اظہار و ابلاغ کی قوت بھی عطا ہوتی اور عربی نثر اور شاعری میں وہ ایک طاقتور قائل کرنے والا اسلوب لے کر آتا تو اس کے یہ نظریات زیادہ مقبول ہوتے اور شاید عربوں کی زندگی اور رہن سہن پر ان کے اثرات دیکھے جا سکتے۔

تیسری بات یہ کہ جبران خلیل جبران نے اپنے عربی اسلوب کی کمزوری کا مداوا بہت ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ' یوں کیا کہ انجیل کے خاص اسلوب بیان کو اپنے لئے نمونہ ٹھہرایا اور اپنی سب تحریروں اور کہانیوں میں انجیل پیغمبروں کے سے لہجے میں بات کی' جسے پڑھتے ہوئے انسان اس کے حکیمانہ انداز' اس کے ٹھہراؤ اور گمبھیرتا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔اور جبران کی باتوں میں الوہی حکمت و دانش کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ جبران کی بیشتر تحریریں' خاص طور پر بعد کے دور کی دراصل نثری نظمیں ہیں جو کتاب مقدس کے اسلوب اور آہنگ میں لکھی گئی ہیں۔(۱۴)

جبران خلیل جبران کے دو قریبی دوست اور ساتھی میخائیل نعیمہ اور امین الریحانی تھے۔ان میں سے موخر الذکر کے تعلقات جبران کے ساتھ اس کے آخری برسوں میں کچھ اچھے نہ رہے اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ جبران کی موت کے بعد جب میخائل نے اس کی سوانح لکھی تو اس میں جبران کی شخصیت اور فن کی بعض کمزوریوں کی طرف بھی اشارے کئے' جو لکھنے والے کی دیانت کا تقاضا تھا۔اس پر امین الریحانی میخائل کے نام ایک کھلے خط میں اسے معتوب کیا کہ ایک مرے ہوئے دوست کے بارے میں ایسی باتیں لکھنے کیا ضرورت تھی۔ میخائل نے بھی اس کا جواب ایک کھلے خط کی صورت میں دیا اور امین سے کچھ صاف صاف باتیں کیں۔اس خط میں ایک جگہ میخائل کہتا ہے۔

''پھر یہ بھی ہے امین صاحب کہ آپ کو جبران کی ادبی کاوشوں کی زیادہ پروا نہیں تھی اور نہ آپ انہیں کوئی خاص چیز سمجھتے تھے۔اگر آپ بھول گئے ہوں تو میں آپ کو یاد دلاؤں کہ جبران کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے آپ نے ایک شب

میرے ہاں بسر کی تھی، اوراس شب کی کسی ساعت میں ہم براڈوے پر ٹہلنے نکلے تو جبران اوراس کے ادب کا ذکر چل نکلا اور آپ نے صرف دو انگریزی لفظ بول کر جبران کے ادب کی حقیقت بیان کردی اور وہ لفظ تھے Mawkish sentimenalism مراد یہ کہ جبران کے ہاں سوائے ایک بدمزہ اور رقت آمیز جذباتیت کے اور کچھ نہیں۔''

میرا خیال ہے، ہم دوسروں کی بات چھوڑیں، جبران کے ایک بہت ہی قریبی دوست نے ایک رات نیویارک کے براڈوے پر چہل قدمی کرتے ہوئے اس کے ادب کے بارے میں جو الفاظ استعمال کئے تھے اوراس کے دوسرے بہت ہی قریبی دوست نے جن کی تردید نہ کی تھی، وہی ہمارے لئے اس موضوع پر حرف آخر ہونے چاہیں۔(۱۵)

المصادر والحواشی

۱۔ می وجبر، جمیل جبر، دار صادر بیروت، ۱۹۵۰ء، ص:۸۵

۲۔ جبران خلیل جبران: میخائیل نعیمۃ، دارالفکر بیروت، ۱۹۶۱ء ص:۷۷

۳۔ جبران الدکتور جمیل جبر، بیروت، ۱۹۷۷ء، ص:۴۵

۴۔ Khalil Gibran, His background, character and works s, Hawi, U.S.A, 1970, Page:92

۵۔ This man from Lebanon:Jibran Khalil Jibran: Barbara jung, U.S.A 1970, page:63

۶۔ اخوان الصفا اور دوسرے مضامین، محمد کاظم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۶

۷۔ کلیات خلیل جبران: ملک اشفاق، فکشن ہاؤس، ۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور، پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص ۱۳

۸۔ عربی ادب کی تاریخ (دور جاہلیت سے لے کر موجودہ دور تک): محمد کاظم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور پاکستان ۲۰۰۴ء ص ۳۸۶

۹۔ عربی ادب میں مطالعے، محمد کاظم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور پاکستان ۲۰۰۵ء ص ۸۱

۱۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ طبع اوّل دانش گاہ پنجاب لاہور پاکستان ۹۱۸۴ء، ۸۵/۴

۱۱۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، ادارہ تحریر و ترتیب: سید سبط حسین، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر فیض احمد فیض، نصیر وارثی، حسن عابدی، سعید لخت، چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۵ء مطبوعۃ فیروزسنز لاہور، ص ۵۱۲

12- A Critical introduction to Modern Arabic poetry: M.M Badwai, London 1969, Page 88

13- Modern Arabic poetry- An Anthology Eidted by Salma Khadra Jayyusi, London 1971, Page 65

14- Modern poetry of the Arab world: Abdullah-ul-Udhari, 6th printing, U.S.A 1970, Page44

15- Modern Arabic poets: IssaJ.Boullata, London 1983, Page78